



# فقیراپل

کیجا میں کھلے والا ایک کنول جس کا کل اٹاٹھ  
پالش کی مشین ڈبیاں اور ایک برش تھا

بورڈ نہ تھا۔ اندر چند لکڑی کی پرانی کرسیاں اور بیچ تھے لیکن قابل دید چیز کباب کی سیخیں تھیں۔ پانچ فٹ تا چھ فٹ لمبی سیخوں میں قیمہ کباب پروئے ہوئے نوواردوں کو دہشت زدہ کر دیتے تھے بعض شوقین مزاج سیخ سمیت کبابوں کا سودا کرتے اور منہ مانگی قیمت ادا کیا کرتے تھے۔

کباب کی لذت اپنی جگہ اور اس کے بولنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے دہلی والے مرزا باقر داستان گو کی روح اور زبان اس میں سرایت کر جاتی تھی۔ میرے ایک شاعر دوست کا کہنا تھا کہ وہ کباب سے زیادہ اپنی زبان کو چرب آلود کرتا ہے۔ میں جب بھی ڈھاکا جاتا چوک بازار کے ایک دو پھیرے ضرور لگاتا اور چوک بازار جانے کے بعد بھیا حنیف کی دکان پر نہ جانے کا مطلب ڈھاکے سے ہمیشہ کے لیے رخصت۔

جی ہاں! بھیا حنیف اس کباب والے کا نام ہے۔ بھیا حنیف مجھ سے اکثر اوٹ پٹانگ فرمائشیں کیا کرتا تھا جن کو پورا کرنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک بار اس نے فرمائش کی۔ ”بھائی! کیا آپ کراچی سے بندو کباب والے کو یہاں اغوا کر کے نہیں لاسکتے۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔  
”اس کو کہوں گا یا تو میرا شاگرد بن جائے یا تجھے اپنا شاگرد بنا لے۔“

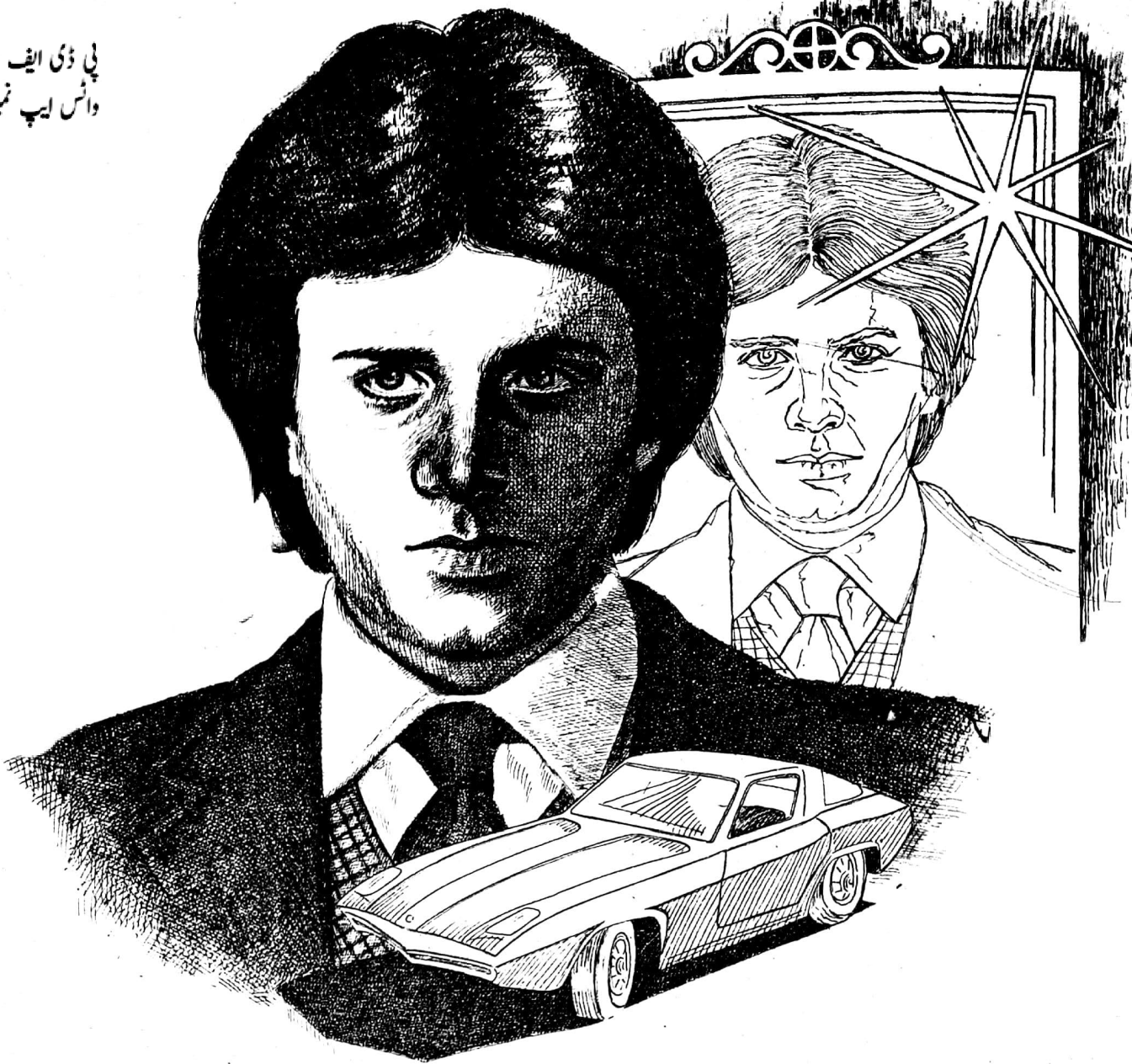
”یہ بات تو تم اسے خط میں لکھ کر بھیج سکتے ہو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”ارے بھائی! آپ تو میری بات ہی نہیں سمجھ۔ خط میں وہ مزا کہاں، جب میں اسے اپنی دکان کی ایک کرسی پر بٹھا کر یہی بات کہوں گا اور اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب غائب گردوں گا تو پھر آپ جانتے ہی ہیں اس کے پاس میری شاگردی اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہے گا۔ پھر تو ایک سال میں میرا گھر بھی گلشن میں بن جائے گا۔“ وہ یہ زور سے بولتا اور قہقہہ لگاتا۔

گو اس کہانی میں نہ تو کوئی کہانی پن ہے اور نہ ہی افسانوی رنگ آمیزی بلکہ یہ ایک عام سی سرگزشت ہے۔ اگر ہم اپنی تخیل کو گروں جھکا کر ارد گرد دیکھیں تو اس سرگزشت کے کردار ہمیں بکاسانی چلتے پھرتے دکھائی دیں گے لیکن یہ دوسری بات کہ ہم تین دوڑتے ہوئے نہ تو انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی سمجھنا چاہتے ہیں۔

وہ کافی دیر سے چوک بازار کے سامنے مٹھائی کی دکان کے قریب کھڑی ہوئی کبھی مٹھائی کے تھالوں کی طرف اور کبھی کبابوں کی دکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میری نگاہ اتفاقاً اس پر پڑ گئی۔ میں کباب والے کے پاس بیٹھا اسے پاکستان کے حالات سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ مجھے ڈھاکا کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سن رہا تھا۔ ان کہانیوں میں ان فلاشوں کی کہانیاں بھی شامل تھیں جو بنگلہ دیش بننے سے قبل فقیراپل کے علاقے میں اٹھائی گیری کیا کرتے تھے، کبھی مسجدوں میں نمازیوں کی جوتیاں چراتے اور اپنے پیٹ کا دوزخ بھرا کرتے تھے۔ ان کا پیٹ واقعی پاپی تھا۔ ان کے پاس رات گزارنے کے لیے فٹ پاتھ کے بستر تھے، بارش کے دنوں میں وہ بینکوں، اسکولوں اور دفاتروں کے برآمدے میں بسیرا کر لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مخالفوں کے جلسوں کا تختہ الٹنے کا کاروبار بھی کیا کرتے تھے۔ ادھر ادھر تاک جھانک کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے لیکن یہاں ان کا کوئی بس نہیں چلتا تو اسلام پور روڈ پر چلے جاتے جہاں ٹکے سیر کے حساب سے ان کے من کی مراد مل جاتا کرتی تھی۔ لیکن بنگلہ دیش بننے ہی نہ جانے ان کے پاس کہاں سے دولت کی برکھا ہوئی کہ وہ فقیراپل کے علاقے کو چھوڑ کر گلشن میں چلے گئے اور وہاں بہاریوں کے بنگلوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے اور ان بنگلوں کے حقیقی مالک یا تو پاکستان چلے گئے یا پھر وہ کیمپوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ کچھ گزیر بسر کے لیے نوکری کرتے اور زیادہ تر فقیراپل میں وہی کچھ کرتے ہیں جو گلشن جانے والے کیا کرتے تھے۔ کباب والے کی معلومات اس لیے بھی زیادہ تھیں کہ وہ خود فقیراپل کے علاقہ میں رہتا تھا اور وہی نہیں بلکہ اس کے دادا نے بھی یہیں رہائش اختیار کی تھی۔ اس کی دکان دور دور تک مشہور تھی ایک تو کباب کی لذت کے باعث اور دوسرے کباب کے قدو قامت کی وجہ سے۔ جی ہاں کباب کا بھی قدو قامت ہوتا ہے۔ اس کی دکان پر کوئی سائن



اور سڑک پار کر کے بھیا حنیف کی دکان کے پاس آکر ٹھہر گئی۔ وہ مجھے ذرا زیادہ گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے وہ میرے بارے میں یقین کرنا چاہتی ہو کہ اس نے صحیح آدمی کو پہچانا ہے۔  
بھیا حنیف نے اسے چھیڑا۔ ”ہاں! اب ذرا غور سے دیکھ جی ٹھنڈا کر لے۔“

”ہم تو ان کو تین روز (روز) سے دیکھا ہے۔“  
”کیوں؟“ میں نے اس کو نہ پہچانتے ہوئے سوال کیا۔  
”سار (سر) آپ کا نام بدر منیر صاحب ہے؟“  
اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ یہ تو میرا نام بھی جانتی ہے، نہ جانے کس طرح؟  
”ہاں۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔  
اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سار! امی رامو کا مال۔“

رامو کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکے ہونے لگے، آنکھوں کے سامنے بجلیاں سی رقص کرنے لگیں۔ مجھے یاد آگیا۔ رامو کون تھا؟ میرے سامنے ۲۵ سال قبل کا ایک ننھا سا لڑکا آکھڑا ہوا۔ اس کی بغل میں ایک تھیلا تھا۔ جس میں بالش کے دو تین برش اور بالش کی ڈبیا تھیں۔ اس کی ناک مسلسل بہہ رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ لیکن آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال کے لگ بھگ

”بھیا حنیف کی فرمائشیں بھی اسی طرح کی ہوا کرتی تھیں۔ بھیا حنیف دلی سے ڈھاکا آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں کسی مکتی باہنی والے نے دھمکی دی تھی۔ بھیا حنیف! اگر تو نے ڈھاکا چھوڑا تو یاد رکھ ہم کراچی آکر تیرے پیٹ میں چھری بھونک دے گا۔“ بس بھیا حنیف اس دھمکی سے ڈر گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ شادی بھی انہوں نے کسی مقامی لڑکی سے کی تھی اور اب وہ ان کے دس بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کی ماں ہے۔  
میں بھیا حنیف کی دکان میں بیٹھا کباب بھی کھاتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی سامنے کھڑی ہوئی عورت کو بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ اور سر کے بال سفید سے سفید تر ہاتھ کانپ رہے تھے اور اتنی دیر سے کھڑے کھڑے اس کے پاؤں میں تجھی شاید کھڑے رہنے کی سکت جواب دیتی جا رہی تھی۔ بھیا حنیف نے مجھے اس کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھا تو دلی والوں کے انداز میں بول اٹھا۔

”بھائی میاں کو شاید زیادہ ہی پسند آگئی ہے، بلا دوں اس کو۔“ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے آواز دے بیٹھا۔  
”ارے دور دور کھڑی کیا نظارے کر رہی ہے، قریب آکر دیکھ دو لہا میاں کو، آنکھوں کی چمک تیز ہو جائے گی۔“ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بلایا بھی۔  
بھیا حنیف کی زبان تو وہ نہ سمجھ سکی لیکن اشارہ سمجھ گئی

ہوگی۔ جسم ناقہ زدہ، چہرہ سوکھا ہوا، ایک گنجی (بنیان) اور ایک پھٹی پرانی لنگی زیب تن تھی اور ننگے پاؤں۔

”سار! پالش اونٹنی چار آنہ۔“

اس کے ”اونٹنی چار آنہ۔“ کہنے پر مجھے ہنسی آگئی، وہ فوراً اپنا تھیلا ایک طرف رکھ کر زمین پر ہی بیٹھ گیا اور میرے پاؤں سے جوتے اتارنے لگا۔

”ابے! ایک جوتے میں تیرا کیا بنے گا، سامنے میرے دوسرے جوتے اور چیل پڑے ہیں ان کی بھی پالش کر دے۔“

وہ ایک دم خوش ہو گیا، اس نے بڑی محنت سے جوتوں کو چمکانا شروع کیا، ایک گھنٹے میں اس نے میرے جوتے اور چیل پالش کیے اور پھر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ دیا تو وہ تھیلا رکھ کر باہر جانے لگا۔

”ابے! باہر کدھر جا رہا ہے اور جا رہا ہے تو اپنا سامان بھی لے جا۔“

”سار! ہم پانچ ٹکے کا چینج لینے جا رہا ہے۔“

”بھاگ جاشیطان! اب تجھ سے میں پیسے واپس لوں گا۔“

”سار! ہمارا نام رامو ہے، اس نے یہ کہا اور پھر یہ جاو

جا۔

پھر دوسرے تیسرے دن وہ میرے دفتر کے پھیرے لگانے لگا، ایک دن وہ اپنے باپ کو لے کر میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔

”سار! ہمارے ابا کو اپنے دفتر میں رکھ لو اس کو ٹائپ کرنا بھی آتا ہے۔ اس کو آپ ایک سو ٹکا مینے میں دے دیجئے گا، آپ کے بچوں کو دعائیں دے گا۔“

اس نے اس انداز میں یہ بات کہی کہ مجھے ہنسی آگئی اور پھر ہنسی آنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کا کام بن گیا۔ پھر دو ماہ کے بعد میں نے اسے بھی دفتر ہی میں رکھ لیا۔ اس کی ناک بہنی بند ہو گئی تھی اس نے پرانے بازار سے ایک پتلون اور جرسی خریدی، پاؤں میں چیل اور جسم صاف ستھرا، اس کے چہرے پر زندگی کی رونق آنے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندو ہے اور وہ اپنے گھر والوں سمیت فقیرا پل میں رہتا ہے۔ مجھے اس انکشاف پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ہندو ہے کیونکہ یہ بات تو اس کے نام سے ظاہر تھی۔ پھر اس کے باپ کا نام شامویا شام ناتھ تھا جس سے رہی سہی کسر پوری ہو گئی تھی۔ پھر ایک دن اس نے کہا۔

”سار! ہمارے گھر والے آپ کو دعوت دینا چاہتے ہیں، اپنے گھر پر، اتوار کا دن کیسا رہے گا، آج جمعہ ہے۔“ وہ رکے بغیر بولتا رہا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن رامو یہ بات تو تمہارے ابا کو بولنی چاہیے تھی۔“

”ابا صرف کام کرتا ہے، بولنے کا کام اس نے میرے

حوالے کر دیا ہے۔“ رامو نے پیار سے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ہماری باتوں سے بے نیاز ٹائپ رائٹر کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ وہ اول تو بات کرتا ہی نہیں تھا، اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور اگر کبھی بولتا تو اس طرح جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بڑی تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عرصے تک مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی اور معلوم اس دن ہوئی جب میں اس کے گھر گیا۔ فقیرا پل کے علاقے میں زیادہ تر کم آمدنی والے اور بغیر آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے تابوت نما کمرے جن میں پورا خاندان رہائش پذیر تھا، رامو کے گھر والے بھی اسی قسم کے دو کمروں والے ایک ڈربے میں رہتا تھا اور ان ڈربوں میں رامو کے علاوہ پندرہ افراد رہتے تھے۔ ماں باپ، تین بھائی اور گیارہ بہنیں۔

رامو کے باپ کی تم گوتی بلکہ خاموش رہنے کا راز وہی گیارہ بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکا کیونکہ اس کی آمدنی اسی روپے ماہوار سے ایک سو بیس روپے ماہوار تک تھی۔ اس کے دونوں بڑے بیٹے سائیکل رکشہ ڈرائیور تھے اور ان کی شادیاں اس لیے نہیں ہوئی تھیں کہ گیارہ بہنیں غیر شادی شدہ تھیں۔ ابھی ان کے ہاتھ پیلے کرنے تھے پھر ان کے بعد بھائیوں کی باری آتی تھی۔

دعوت سے ان لوگوں نے فوری طور پر دو فائدے اٹھائے، ایک تو یہ کہ شام ناتھ کی تنخواہ میں بیس بیس روپے کا اضافہ اور رامو کی بھی میرے دفتر میں اوٹ پٹانگ قسم کی ملازمت اس کی تنخواہ پچاس روپے مقرر ہوئی، اس طرح یک بیک اس خاندان کی آمدنی میں اسی روپے کے اضافے سے محدود پیمانے پر سہی اس خاندان میں خوش حالی کی ہلکی سی لہر اور امید کی دھندلی سی کرن نمودار ہو گئی۔

ایک دن رامو کو میں نے انگلش ٹیچر کی ایک کتاب پر جھکا ہوا دیکھا، میں نے اگلے دن اسے محمد پور کے ایک پرائمری اسکول میں داخلہ دلادیا۔ ٹیچر اس کے نام سے ناراض اور کام سے بہت خوش تھے۔ وہ بڑی محنت سے پڑھائی کرتا تھا اور دنوں کا کام گھنٹوں میں کرتا تھا۔ ایک دن اس پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر میرے دفتر تشریف لائے تو انہوں نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔ ”جناب! یہ لڑکا جس کا نام رامو ہے، ضرور میرا نام روشن کرے گا۔“

میں نے سمجھا شاید رامو سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اور ہیڈ ماسٹر صاحب اس کی شکایت کرنے کے لیے تمہید باندھ رہے ہیں۔ میں نے کچھ بولنا چاہا تو وہ بول اٹھے۔

”آپ نے دو ماہ قبل اسے پہلی میں داخل کرایا تھا اب وہ اس قابل ہے کہ چوتھی جماعت کا امتحان پاس کر سکے اس کا ذہن تو کمپیوٹر ہے کمپیوٹر!“



”اچھا۔۔۔“ میری زبان سے فقط ایک لفظ برآمد ہو سکا۔  
”جی ہاں، اب آپ اسے پانچویں جماعت میں داخل کرانے کا انتظام کیجئے۔“

ہیڈ ماسٹر نے مجھے عجیب و غریب ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر وہ اسی طرح پڑھتا رہا تو اگلے سال کے آخر میں میٹرک پاس کر لے گا اور پھر وہ چاہے تو چار ماہ میں بی اے بھی کر لے گا اور اس کے بعد اس کے بعد اس کے بعد اس کے بعد۔۔۔! جی سارے۔۔۔ آپ کیا سوچ رہا ہے، ہم کو چینا (پہچانا) کہ نہیں؟

میرے سامنے رامو کی ماں کھڑی کانپ رہی تھی اس نے مجھے پھر اپنے خیالوں کے سفر سے چوک باز میں واپس بلا لیا۔  
بھیا حنیف مجھے یوں خیالوں میں گم دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

”بیٹھو۔“ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھلا دیوی سے کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ”رامو کو تھائے؟“ (رامو کہاں ہے)  
اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ گلشن میں ہے اس کے پاس بنگلہ ہے، بیوی ہے اور دو موٹر ہے، نوکر چاکر بھی ہے۔“

”اچھا۔۔۔ تم لوگ کدھر ہو؟“  
ہم ادھر ہی فقیر ایل میں رہتا ہے لیکن ذرا بڑے مکان میں۔ بیٹی سب کا شادی کر دیا اور اس کا بڑے بھائی ادھر موٹی جھیل میں ہوٹل کرتا ہے۔  
”کیا وہ گدھا تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھتا؟“  
”وہ تو بہت چاہتا ہے لیکن۔۔۔“

”اس کی بیوی نہیں چاہتی ہوگی۔۔۔؟“  
”وہ تو بے چاری بہت چاہتی ہے، بار بار میرے پاس آتی ہے، کہتی ہے اماں ہمارے پاس چلو۔“  
”پھر تم کیوں نہیں گئیں؟“  
”شریمان نہیں چاہتے۔“  
”شریمان۔۔۔؟“ میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں رامو کا باپ وہ بولتے ہیں کہ ہم نے ساری زندگی محنت کر کے کھایا ہے، نکلیا ہے اب آخری وقت میں اپنے بیٹوں کا کمائی کھاؤں گا۔“ اس کے لیے سبزی ترکاری لے کر آؤں گا اور تم اس کے جھوٹے برتن صاف کروگی۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اب سار! آپ دونوں باپ بیٹوں میں سے کسی ایک کو سمجھا لیجئے۔“ اس کی بیوی کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔  
”اسے کیا دکھ ہے؟“

”ان کی شادی کو دس سال ہو گیا ہے لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوا۔ اتنے سال میں تو ہمارے ہاں سات۔۔۔“

پھر آسے خیال آیا کہ وہ روانی میں کیا کہہ گئی ہے، وہ چپ ہو گئی لیکن اس کے چہرے پر شرم و حیا کے ان گنت چراغ روشن ہو گئے جیسے وہ ابھی بائیس سال کی عورت ہو۔

”اس کے اولاد نہ ہونے کا ان باپ بیٹوں کی ضد سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بات یہ ہے سار! کہ اس کی بیوی نے بھی قسم کھایا ہے کہ جب تک ہم دونوں اس کے گھر میں نہیں رہیں گے وہ رامو کو باپ نہیں بنے دے گی۔“  
”لیکن یہ کیسی ضد ہے؟“

”بات یہ ہے سار! اس کی بیوی کا کہنا ہے جن بچوں کو دادا دادی نہ ملیں ان کو پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔“  
میں سنائے میں آ گیا۔



آخر رامو کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ اپنے باپ کی ضد کے سامنے وہ گلشن کے آرکنڈیشنڈ بنگلے کو چھوڑ کر فقیر ایل کے ایک مکان میں آ گیا۔ جو کافی بڑا تھا۔ لیکن اس میں آرکنڈیشن نہیں تھا اور اتنی تنگ گلی میں تھا کہ اس میں کار داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ رامو کے ہاں ایک نہیں بلکہ تین بچے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے۔ بھیا حنیف نے اس پر تبصرہ کیا۔ اس کی عادت ابھی تک نہیں گئی، وہی بچپن والی حرکتیں، ایک ماہ میں تین جماعتیں پاس کرنے کی عادت، یہ بات بھیا حنیف نے رامو کے فقیر ایل والے مکان میں مٹھائی کھاتے ہوئے کسی جسے سن کر دونوں میاں بیوی شرمائے بڑے بھائی نے انہیں شرماتے دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں، لیٹ نکالنے کی عادت بھی اچھی ہے پھر اس نے اپنے دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے سوچنے والے انداز میں کہا، دس سال کالیٹ کتنے سال میں نکلے گا؟

رامو کی کمائی کا ایک حصہ تو یہاں ختم ہوا، لیکن اس کی اور بھی کمائیاں ہیں۔ فقیر ایل کی آغوش میں جنم لینے والا لڑکا جس کی بغل میں پالش کی ڈبیا اور برش تھے ان دنوں بین الاقوامی شہرت یافتہ پائلٹ ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کو اپنی بہت سی کمائیاں سنائے گا۔ اس نے کئی بین الاقوامی کمپنیوں میں ملازمت کی ہے اور اس کے جہاز میں دنیا کے بیشتر دی آئی پی شخصیتیں سفر کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ اس نے ان سب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان بڑے آدمیوں کو پل بھر میں اس نے چھوٹے آدمیوں کا روپ دھارتے دیکھا ہے۔ اس نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”سار! کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے ان وی آئی پی لوگوں کے ہاتھوں میں پالش کی ڈبیا اور برش پکڑا دوں اور انہیں جہاز سے دھکیل دوں۔“